تحقیق: الدکتور محمد عبدالرحمٰن البکر المحترم
ترجمہ و ترتیب: حافظ محمد عمار خان ناصر

# اسرائیلی روایات کا پس منظر اور معیارِ قبولیت

لفظ "اسرائیلیات" بنی اسرائیل کی نسبت سے ہے۔ اسرائیل ان کے باپ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کا نامِ گرامی تھا۔ اسرائیلیات سے مراد وہ یہودی معارف و روایات ہیں جن کی بنیاد تورات اور تالمود پر ہے یا جو ان کی خرافات ان کے علاوہ ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اسرائیلیات میں مسیحی روایات بھی شامل ہیں اور یہودی روایات کے غلبہ کی وجہ سے ان کو اسرائیلیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ تفاسیر و تاریخ میں نصرانی روایات اور یہودی روایات کے مقابلہ میں ان کے بُرے آثار بھی کم ہیں کیونکہ عیسائی روایات بیشتر اخلاق و مواعظ پر مشتمل ہیں۔

اسرائیلی روایات کے راوی ظاہری طور پر وہ یہودی و عیسائی علماء ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اسرائیلیات کے کتبِ تفسیر و تاریخ میں دخول کے اسباب کیا ہوئے۔

ان اسباب کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے سابقہ ادوار کے بعض واقعات و مباحث کو بیان فرمایا ہے۔ یہ چیزیں توراۃ و انجیل میں بھی بیان ہوئی ہیں لیکن قرآن کریم نے بعض مسائل کی جزوی تفصیلات سے تعرض نہیں کیا بلکہ واقعہ کی اصلیت اور اس میں مقامِ عبرت کے اظہار پر اکتفا کیا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت آدمؑ کے قصہ میں قرآن کریم نے جنت کے محلِ وقوع اور شجرِ ممنوعہ کی نوع بیان نہیں کی ہے جبکہ تورات میں بیان ہے کہ یہ درخت جنت کے وسط میں تھا اور حیات اور خیر و شر کی پہچان کا درخت تھا اور یہ کہ حوا علیہا السلام سے سانپ مخاطب ہوا تھا وغیر ذالک۔

چنانچہ صحابہ کرامؓ ان تفصیلات کی تلاش کرتے تھے جن سے قرآن کریم نے سکوت فرمایا ہے اور اس کے لیے ان کے پاس نو مسلم یہودی و عیسائی علماء کے سوا اور کوئی وسیلہ نہ تھا۔ یہ علماء اہلِ کتاب انبیاء سابقین کے قصص، اپنے دین کی ثقافت، اپنی قوم کی کہانیوں اور قصوں اور یہود کے مصر سے بابل

کی طرف جلاوطنی کے دوران کے اخبار و حالات سے بخوبی واقف تھے۔ یہاں گولڈزیہر اور احمد امین کا یہ خیال کہ صحابہ کرامؓ نے اہلِ کتاب سے بلا لحاظ وسیع پیمانے پر روایات لیں بالکل غلط ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابوہریرہؓ اہلِ کتاب سے روایات لینے کے بارے میں سخت ترین نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ ان حضرات اور اہلِ کتاب کے مابین ایک قسم کا مجادلہ تھا۔ البتہ تابعین نے اہلِ کتاب کے بکثرت قبولِ اسلام کی وجہ سے ان سے نسبتاً وسیع پیمانے پر روایات نقل کیں۔ تابعین کے بعد کے علماء اسرائیلیات کی تحصیل میں منہمک ہو گئے۔ یہ سلسلہ وسیع پیمانے پر یونانی، رومی، ایرانی اور یہود و نصاریٰ کی کتب کے تراجم کے بعد جاری ہوا۔

ابنِ خلدونؒ نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اسرائیلیات کی روایت کے اسباب دو اعتبار سے ہیں۔ ایک اجتماعی اور دوسرا دینی۔ اجتماعی طور سے یہ کہ اہلِ عرب پر بدوی پن اور ناخواندگی غالب تھی۔ وہ بدءِ خلق، اسرارِ وجود اور کائنات کی اشیاء کے اسباب کے بارے میں جاننے کے خواہش مند تھے اور اہلِ کتاب کے سوا ان کو کوئی یہ نہ بتا سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان سے سوال و نقل کرنے کا کام کیا۔ دینی اعتبار سے یہ کہ یہ مرویات عقائد و احکام سے متعلق نہ تھیں اسی لیے مفسرین نے اس ضمن تساہل سے کام لیا اور جانچ پڑتال کی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ امام احمدؒ فرماتے ہیں، ثلاث لیس لہا اصل: التفسیر والملاحم والمغازی کہ تفسیر ملاحم اور مغازی کی کتابوں کی کوئی اصل نہیں ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا علماء اسلام نے ہر قسم کی اسرائیلیات کو ردّ کر دیا ہے یا بعض کو قبول بھی کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علماء اسلام نے اسرائیلیات کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ پہلی قسم وہ روایات ہیں جو کتاب و سنت کے موافق ہیں۔ یہ قسم مقبول اور صحیح ہے اور اہلِ کتاب پر اقامتِ حجت کے لیے ایسی روایات کو بیان کرنا بھی درست ہے کیونکہ یہ خود ان کی کتابوں میں وارد ہیں۔ مثلاً اہلِ کتاب کی روایات میں آتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کا نام خضر علیہ السلام تھا۔ یہی نام صحیح بخاری کی ایک حدیث میں آیا ہے۔ اس قسم کی روایات کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے، "بلّغوا عنّی ولو آیۃ وحدّثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج ومن کذب علیّ متعمّداً فلیتبوّأ مقعدہ من النار" کہ میری طرف سے پہنچا دو اگرچہ ایک ہی آیت ہو اور بنی اسرائیل سے (لے کر) بیان کرو کوئی حرج کی بات نہیں اور جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھے پس اس نے اپنا ٹھکانہ آگ میں بنا لیا۔ دوسری قسم ان روایات کی ہے جو کتاب و سنت کے مخالف ہو۔ یہ قسم بالکل مردود ہے۔ اس کو بیان کرنا اور روایت کرنا درست نہیں ہے۔ امام مالکؒ فرمانِ نبوی حدّثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج کے بارے میں

فرماتے ہیں کہ جواز اس وقت ہے جب کوئی اچھی بات ہو اور اگر اس کا کذب معلوم ہو جائے تو جواز نہیں ہے۔
تیسری قسم وہ ہے جس کے بارے میں کتاب وسنت میں سکوت ہو۔ یہ قسم پہلی دونوں قسموں سے جدا ہے۔ اس قسم کی روایات پر ہم نہ ایمان لاتے ہیں کیونکہ کذب کا احتمال ہے اور نہ تکذیب کرتے ہیں کیونکہ صدق کا بھی احتمال ہے۔ البتہ اس قسم کی روایات کو بیان اور روایت کرنا درست ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تصدقوا اهل الکتاب ولا تکذبوهم وقولوا امنا بالله وما انزل الینا وما انزل الیکم" کہ اہل کتاب کی تصدیق کرو نہ تکذیب بلکہ یہ کہہ دو کہ ہم اللہ پر اور اس چیز پر جو ہماری طرف اور اس چیز پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ایمان لاتے ہیں۔

دیکھیے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو نہی وارد ہے کہ: "لا تسئالوا اهل الکتاب" اہل کتاب سے سوال نہ کرو اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے تورات پڑھنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ناراض ہونا، تو وہ احکام کے استقرار سے قبل کی بات ہے اور اہل کتاب سے روایات بیان کرنے کا جواز، استقرار احکام اور خوف فتنہ کے رفع ہو جانے کے بعد کی بات ہے۔

اس تمہید کے بعد گزارش ہے کہ تاریخ اسلامی میں اسرائیلیات کے اثر اور صورت حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تاریخ کے مفہوم، اس کے طریق تدوین، اس کے فوائد، اسرائیلیات کے دخول اور چند اسرائیلیات کی مثالوں کی وضاحت کی جائے۔ پھر تاریخ میں اسرائیلیات کے اثر اور آخر میں یہ بتایا جائے کہ علماء نے اس کا کیا علاج تجویز کیا ہے اور وہ کون سے قواعد اور ضابطے ہیں جو علماء نے فن تاریخ کے لیے وضع کیے ہیں۔

## تاریخ کا مفہوم

"تاریخ" مشتق ہے أرَّخَ، وَرَّخَ سے۔" یقال ارخ ورخ الکتاب ای حدد تاریخه وارخ الحادث ونحوه فصّل تاریخه وحدد وقته" "تاریخ اقوام ہے۔ ان کی نشأۃ طور وطریق اور آثار کا ذکر کرنا۔ ویقال فلان تاریخ قومه ای الیه ینتهی شرفهم وریاستهم۔

## تاریخ کی تدوین

نسل انسانی کا ایک طویل زمانہ ایسا رہا ہے جس میں تاریخ کی تدوین نہیں ہوئی تھی کیونکہ انسان لکھنا (پڑھنا) نہیں جانتا تھا اور اس کی زیادہ تر کوشش ضروریات زندگی مہیا کرنے میں منحصر تھی۔ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ انسان اپنے ساتھ پیش آنے والے اور انسانی زندگی پر اثر پذیر ہونے والے واقعات محفوظ کرنے لگا۔ مثلاً طوفان نوحؑ، قحط سالی اور خونریز جنگیں وغیرہ۔ بعد کی انسانی نسلیں ان واقعات کو نقل کرنے اور مبالغہ سے کام

بننے لگیں جس سے یہ قصے حقائق سے زیادہ خرافات بن کر رہ گئے۔ اس کے نتیجے میں الیاذۃ[1] میں یونانی میتھولوجی، مہابھارت[2] میں ہندوؤں کی روایات، شاہنامہ[3] میں ایرانیوں کے حالات اور اہلِ عرب کے کلام میں عرب بائدہ کے حالات جیسے خرافات وجود میں آئے۔ اس کے بعد ایسے مجموعے سامنے آئے جو نسبتاً تاریخ سے قریب تھے جیسے قدیم ہجرتیں اور جنگیں، اسلام سے پہلے کے ایام العرب اور عام الفیل وغیرہا۔ اس کے بعد جب تدوین کا زمانہ آیا تو ایسے مجموعے تاریخ کے مصادر قرار پائے۔ مسلمانوں نے ایک ہی زمانے میں تاریخ کی تدوین تالیف اور تفسیر قرآن و حدیث و سیرت کی تالیف کا اہتمام اور انتظام کیا۔

ہم تک اس زمانہ کی چند کتب بھی پہنچی ہیں جو عبداللہ بن سلامؓ، کعب الاحبارؒ اور وہب بن منبہؒ کی طرف منسوب ہیں۔ آخر الذکر کی کتاب کا نام "کتاب الملوک" ہے ان کی اور ان کے معاصرین کی کتب مسلمانوں کے ہاتھ تاریخ کے مقدمات سمجھی جاتی ہیں۔ اس علم کا آغاز مغازی کی کتب سے ہوا۔ مغازی میں سب سے پہلی تصنیف حضرت عروہؒ بن الزبیر بن العوامؓ (المتوفی ۹۹ھ) کی ہے۔ ابن اسحاق، واقدی اور طبری نے اس کتاب سے بہت استفادہ کیا ہے۔ ان کے بعد ابانؒ بن عثمانؓ بن عفان (المتوفی ۱۰۵ھ) آئے پھر محمد بن مسلم بن شہاب الزہریؒ نے ایک ہی موضوع سے متعلق اخبار کو جمع کر دیا یہ طریقہ سب سے پہلے زہریؒ نے ہی اپنایا اور بعد میں آنے والے سبھی اس رستے کے سالک ہوئے۔ ان میں سب سے بڑے مؤرخ محمد بن اسحاق بن یسارؒ (المتوفی ۱۵۱ھ) ہیں۔ ان کی کتاب طبع تاریخ گوئی کے لیے راہنما سمجھی جاتی ہے جو کہ تین اقسام پر مشتمل ہے: المبتدأ، المبعث اور المغازی۔ المبتدا میں ابتدائے خلقت سے لے کر تا بعثتِ نبوی عصرِ جاہلی کی تاریخ ہے۔ المبعث میں پہلی سن ہجری تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کی تاریخ ہے اور المغازی میں آپؐ کی وفات تک کی تاریخ ہے۔

---

[1] الیاذۃ (ILIADE) یونانی زبان کی ایک جنگی کہانی ہے جو ۲۴ اشعار پر مشتمل ہے سلیمان البستانی نے اس کا عربی ترجمہ ۱۹۰۴ء میں دار الہلال مصر سے شائع کیا ہے۔

[2] مہابھارت سنسکرت زبان میں دو لاکھ اشعار پر مشتمل ہے ۲۰۰ یا ۱۵۰ قبل مسیح میں لکھی گئی۔ اس کا عربی ترجمہ ودیع البستانی نے ۱۹۵۱ء میں کیا۔

[3] شاہنامہ فردوسی (م ۱۰۲۰ء) نے فارسی میں لکھا۔ ساٹھ ہزار شعروں پر مشتمل اس شاہنامہ میں ابتدائے تاریخ سے لے کر فتوحاتِ عرب تک کے ایرانی بادشاہوں کے قصے درج ہیں۔ اس کا ترجمہ عربی کے علاوہ یورپ کی چند زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ (از مترجم)

ابن اسحاق کی اصل کتاب گم ہوگئی ہے اور اس کے صرف چند اوراق موجود ہیں جس کا سراغ گرد ہمان نے لگایا۔ البتہ ابن اسحاق کی کتاب کو علماء کے ایک گروہ نے نقل کیا ہے۔ سب سے اہم کام عبدالملک بن ہشام (المتوفی ۲۱۸ھ) نے سیرۃ ابن ہشام میں کیا ہے۔ انہی میں ابن سعد اور طبری ہیں۔ چنانچہ انگریز مستشرق فریڈجیوم نے ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے واسطوں سے مروی سیرۃ ابن اسحاق کو انگریزی ترجمہ کے ساتھ ایک ضخیم جلد میں ۱۹۵۷ء میں شائع کیا ہے۔ ابن اسحاق کے بعد محمد ابن عمر الواقدی (المتوفی ۲۰۷ھ) نے نیا رستہ اختیار کیا اور ابتدائے آفرینش سے لے کر ہارون الرشید کی خلافت تک کی تاریخ کو اپنی کتاب میں سمو لیا لیکن اس کی کتاب بھی گم ہوگئی البتہ اس کے شاگرد ابن سعد (المتوفی ۲۳۰ھ) نے اپنے استاد کی تاریخ کا بہت سا ذخیرہ اپنی کتاب "الطبقات الکبریٰ" میں نقل کر دیا ہے۔

تیسری صدی ہجری کے آغاز میں ثقافت و تمدن کی وسعت اور ۱۷۸ھ میں بغداد میں کاغذ کا پہلا کارخانہ بننے کے طفیل اسلامی تاریخ ایک نئے دور سے آشنا ہوئی۔ اس کے بعد محمد بن جریر الطبری نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ الامم والملوک" میں قدیم تاریخی روایات کو جامع انداز میں پیش کیا۔ اس کے بعد آنے والے مؤرخین نے اسی کتاب پر بلاذری کی کتاب سے اضافہ و ترمیم سے کام چلایا یا پھر طبری کی لکھی ہوئی تاریخ سے اگلے زمانے کی تاریخ لکھی۔

تاریخ کا ایک مستقل فن قرار پانا تھا کہ یہ فن سرعت کے ساتھ ترقی کرتا چلا گیا حتیٰ کہ تاریخی تالیفات کی کثرت اتنی ہوگئی کہ ان کا احاطہ محال ہے۔ چنانچہ کشف الظنون میں شروح، اختصارات اور ضائع شدہ کتب کے علاوہ ۱۳۰۰ مستقل کتبِ تاریخ کا ذکر ہے اور یہ بھی مکمل تعداد نہیں ہے۔

## تاریخ کے فوائد

اس میں شک نہیں کہ کتب تاریخ کی کثرت سے زیادتِ علم، عمقِ فکر، عقل کی پرورش اور وسعتِ معلومات جیسے فوائد حاصل ہوتے ہیں کیونکہ انسان گزشتہ کے لوگوں کے تجربات و حالات سے واقف ہوتا اور ان سے استفادہ کرتا ہے۔ امام شافعی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ علم تاریخ سے عقل بڑھتی ہے۔ علماء نے تاریخ کے بہت سے فوائد بیان کیے ہیں لیکن یہاں ہم صرف ایک قصہ کے مطالعہ سے تاریخ کی عظمت و اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

کسی عالم کا مقولہ ہے کہ "تاریخ سے واقف آدمی جھوٹوں سے اہانت نہیں لے سکتا۔

خیبر کے بعض یہودیوں نے ایک خط ظاہر کیا اور دعویٰ کیا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط ہے اور اس میں آپؐ نے فتح خیبر کے موقع پر یہودیوں سے اسقاطِ جزیہ کا اعلان کیا تھا اور اس خط میں صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کی گواہی بھی پیش کی جن میں حضرت علی ابن ابی طالبؓ، حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت

معاویہؓ بن ابی سفیانؓ بھی شامل ہیں۔ یہ خط علامہ ابوبکر احمد بن ثابت الخطیب البغدادی کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ پر بہتان ہے۔ پوچھا گیا کہ کیا دلیل ہے؟ فرمایا کہ اس میں حضرت معاویہؓ کی گواہی ہے حالانکہ انہوں نے فتح مکہ کے موقع پر ۸ھ میں اسلام کا اظہار کیا تھا جبکہ فتح خیبر ۷ھ میں ہوئی۔ اسی طرح سعد بن معاذؓ ۵ھ میں جنگ خندق کے دوران تیر لگنے سے شہید ہو گئے تھے تو ان کی تو خیبر کی فتح سے دو سال پہلے وفات ہو چکی ہے۔ اس سے اس خط کا جھوٹا ہونا ثابت ہو گیا۔ یہ اس علم کی منقبت ہے جو نفوسِ کریمہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ شاعر کہتا ہے ؎

اذا عرف الانسان اخبار من مضی — توھمتہ قد عاش من اول الدھر
واحسبہ قد عاش آخر عمرہ — مدی الدھر ان ابقی الجمیل من الذکر
فکن عارفاً اخبار من مات وانقضی — وکن ذا انسوال تغتنم اطول العمر

## کتب تاریخ میں اسرائیلیات کا دخول

تاریخ اسلامی میں یہودی و مسیحی روایات کا ذخیرہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کی تفسیر کے پردے میں در آیا ہے۔ علماء نے جب تفسیر قرآن کا شغل اختیار کیا تو انہیں قرآنی مقامات اور حالات کی تحقیق، ابتدائے خلقت، کائنات کے اسرار، انبیاء کے قصص اور گذشتہ زمانے کے لوگوں کے حالات کی معرفت کی حاجت ہوئی۔ ابتدائی تاریخ کی تدوین کے مصادر کے لیے یہ امور اہم حیثیت کے حامل تھے اور جب ہم اسرائیلیات کی روایت کے مراکز تلاش کرتے ہیں جن پر مفسرین نے اعتماد فرمایا ہے۔ تو یہ علماء ہی ہمیں اس کام کے مراکز نظر آتے ہیں۔ انہی حضرات نے تاریخ اسلامی کی اولین تالیف کا بیڑا اٹھایا تھا۔

## چند مثالیں

اسرائیلیات کی اس بحث میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند باطل، علم و عقل کے ساتھ متصادم اسرائیلی روایات کی مثالیں پیش کی جائیں۔

تاریخ طبری اور تاریخ مسعودی میں یہ روایت موجود ہے۔ خدا نے زمین کو مچھلی پر بنایا۔ مچھلی پانی میں ہے۔ پانی ایک چٹان میں ہے۔ چٹان ایک فرشتے کی پشت پر ہے۔ فرشتہ ایک چٹان پر کھڑا ہے۔ چٹان ہوا پر ہے۔ پس مچھلی نے حرکت کی تو زمین میں زلزلہ آ گیا اور کہا گیا ہے کہ زمین ایک چٹان پر ہے اور چٹان ایک بیل کے سینگ پر ہے اور جب بیل حرکت کرتا ہے تو چٹان بھی حرکت کرتی ہے۔

کعب الاحبار سے روایت ہے کہ آسمان اور زمین کے درمیان ایک لطیف بادل ہے۔ اس بادل پر سفید پرندے ہیں۔ ان پرندوں کے سر گھوڑوں کی طرح، عورتوں کی طرح مینڈھیاں اور لمبے لمبے پر ہیں ان کا زمین میں کوئی ٹھکانہ ہے نہ آسمان میں پناہ گاہ۔ یہ بادل پر انڈے دیتے اور ان کو سیتے ہیں

اور بادل پر ایسے رہتے ہیں جیسے پرندے پانی پر رہتے ہیں۔

وہب بن منبہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا علیہما السلام کو جنت میں ٹھہرایا اور ایک خاص درخت سے منع فرمایا۔ اس درخت کی ٹہنیاں آپس میں گھسی ہوئی تھیں۔ اس کے پھل کو ملائکہ ابدی حیات کے لیے کھاتے تھے۔ جب ابلیس نے دونوں کو بہکانے کا ارادہ کیا تو ایک سانپ کے پیٹ میں داخل ہو گیا۔ سانپ کے چار پاؤں تھے۔ جب سانپ جنت میں داخل ہو گیا تو ابلیس اس کے پیٹ سے نکل آیا الیٰ آخر القصہ

## اسرائیلیات کے نتائج

ان اسرائیلیات نے اسلامی تاریخ میں نہایت برُے اثرات مرتب کیے جن میں ایک تو یہ کہ جھوٹے قصے کہانیوں اور خرافات کے اسلامی تاریخ میں جگہ پانے کا دروازہ کھل گیا۔ دوسرا غلط اور صحیح روایات میں اختلاط ہُوا جس سے تشکیک اور اسلام پر انگشت نمائی کا سامان پیدا ہُوا اور مستشرقین اور ان کے ہمنواؤں نے اس کو بڑھا چڑھا کے پیش کیا تیسرا یہ کہ جو اسرائیلیات ابتدائی دَور کے نو مسلم علماء اہل کتاب (حضرت عبداللہ بن سلام، کعب الاحبارؒ، وہب بن منبہؒ) کی طرف منسوب ہیں ان سے بعض لوگوں کو ان حضرات کے بارے میں شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے اور الزامات لگانے کا موقع ملا۔ حالانکہ اکثر روایات ان سے سنداً ثابت ہی نہیں اور جو قلیل تعداد میں ان سے مروی ہیں وہ بھی ان کی تخلیق اور کارسازی نہیں جیسا کہ بعض حضرات نے گمان کیا ہے بلکہ انہوں نے صرف کتبِ اہلِ کتاب سے ان کو نقل کیا ہے کیونکہ وہ اپنے دین کی ثقافت سے واقف اور قبولِ اسلام سے قبل اپنی اقوام کے بڑے علماء میں سے تھے۔ چنانچہ علماء جرح و تعدیل نے ان کو کذب و وضع کے الزام سے بری رکھا ہے اور ایسی روایات کو نقل کرنے کے باوجود وہ علماء جرح و تعدیل کے نزدیک ثقہ اور متدین ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ تاریخ میں ایسی روایات کے دخول کا نقصان تفسیر و حدیث کی کتب میں ان کے دخول کے نقصانات سے کہیں کم ہے۔ تاریخ، اسلامی عقائد، احکام و معاملات کے لیے کوئی بنیادی ماخذ نہیں ہے اس کے برعکس قرآن و سنت عقائد و احکام اور شرع کے اساسی اصول ہیں اور پھر کتبِ تاریخ میں اسرائیلیات صرف ابتدائی حصہ میں درج ہیں جہاں بدءِ خلق، طبیعت، قصص انبیاء سے بحث ہوتی ہے۔ یہ حصہ تاریخ کی مختصر کتابوں میں چند صفحات سے متجاوز نہیں ہوتا جبکہ بڑی کتابوں مثلاً تاریخ طبری میں پہلی جلد کا اکثر حصہ ایسی روایات کے لیے مخصوص ہے جبکہ تفسیر کی بعض کتابیں تو اسرائیلیات سے اٹی پڑی ہیں۔ ہمیں تاریخ میں ان کے خطرات کے وقوع سے انکار نہیں۔ بلاشبہ اس کے برُے آثار سے تاریخ بھی محفوظ نہیں ہے جیسا کہ مستشرقین کے عائد کردہ الزامات سے واضح ہے۔

## علاج

ان بُرے نتائج کے پیش نظر بعض علماء کو ایسی روایات کے نقد و تمحیص اور ان کے کذب کو واضح کرنے کی ضرورت پڑی جیسا کہ ابن کثیر نے البدایۃ والنہایہ میں کیا ہے اور دوسرے علماء نے درست تاریخ کی تدوین و تحقیق کے لیے قواعد ضوابط اور قوانین مقرر کیے ہیں جیسا کہ علامہ تاج الدین السبکی نے اپنی کتاب "قاعدۃ فی الجرح والتعدیل وقاعدۃ فی المؤرخین" میں اور ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں کیا ہے۔

چند قواعد پر روشنی ڈالنے سے پہلے مناسب ہے کہ ہم تدوین تاریخ میں اوائل مؤرخین کے اختیار کردہ طریق کار کے بارے میں کچھ وضاحت کر دیں۔ طبری اپنے طریق تالیف کے بارے میں اپنی کتاب کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں: ہماری اس کتاب کا قاری جان لے کہ جو کچھ ہم نے اس کتاب میں ذکر کیا ہے، بشرطیکہ وہ مذکور ہو، اس کی بنا صرف اخبار و روایات پر ہے جنکی ہم نے اسناد نقل کی ہیں اور حجج عقلیہ اور افکار نفوس کا معدودے چند مقامات کے کہیں ذکر نہیں ہے جبکہ بحث گذشتہ زمانہ کے لوگوں اور ایسی روایات سے متعلق ہو جن کا اتصال عینی شاہدوں تک نہیں ہے اور آج وہ ہمارے علم میں محض اخبار و نقل کے وسیلہ سے آئی ہیں جن میں استخراج عقلی اور فکر نفس کا کوئی دخل نہیں۔ سو ہماری اس کتاب میں گذشتہ زمانہ سے متعلق کوئی ایسی بات جس کو قاری ناپسند کرے یا سامع اس سبب سے اس کو شنیع سمجھے کہ وہ اس کی حجیت کا کوئی قرینہ نہیں پاتا تو وہ جان لے کہ یہ باتیں ہم نے اپنی طرف سے نہیں لکھی ہیں بلکہ ناقلین کے واسطے سے ہم تک پہنچی ہیں اور ہم نے ان کو بعینہٖ درج کر دیا ہے۔"

یاقوت الحموی لکھتے ہیں: "میں نے ایسی اشیاء کا ذکر بھی کیا ہے جن کا عقل انکار کرتی ہے اور عام مانوس عادات سے بُعد کے باعث طبائع ان سے متنفر ہوتی ہیں۔ میں ان پر یقین نہیں رکھتا، ان سے متنفر ہوں اور قارئین کے سامنے ان کی صحت سے بَری ہوں۔ میں نے جس طرح ان کو پایا نقل کر دیا تاکہ اس سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ حق ہو خواہ باطل، سامنے آجائے۔ ایک آدمی مثلاً یہ کہے کہ میں نے زید کو جھوٹ بولتے سنا تو آپ اس کے کذب کی کیفیت بھی جاننا چاہیں گے۔

پھر ائمہ حفاظ کو دیکھیے۔ انہوں نے اپنی مسانید میں (جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں جو کہ منبع احکام ہیں اور جن کے ذریعہ سے حلال و حرام میں فرق کیا جاتا ہے) صحیح و سقیم میں فرق نہیں کیا لیکن اس سے وہ اہل صدق سے خارج نہیں ہوئے۔ انہوں نے جس طرح سن کر محفوظ رکھا اسی طرح ادا کر دیا۔ کذاب تو وہ ہوتا ہے جو کسی حدیث کو وضع کرے یا اس شخص سے نقل کرے جس سے اس نے کبھی سماع یا روایت ہی نہ کی ہو اور جو شخص اس چیز کو ویسے ہی روایت کر دے جس طرح اس نے وہ سُنی ہے تو وہ کاذب

نہیں ہوتا اور اس ضمن میں ذمہ داری اس پر ہے جس نے اس کو بیان کیا ہے الا یہ کہ اہلِ اجتہاد میں سے ہو اور کسی حدیث کو نقل کر کے اس کی تضعیف کر دے ورنہ بہت سی احادیث باطل ہوتیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اوائل مؤرخین کا عام اور غالب طریق کار یہی رہا ہے کہ وہ صحت وسقم کی طرف التفات کے بغیر واقعات کو اسی طرح درج کرتے ہیں جس طرح ان تک پہنچے اور ذمہ داری ان پر ڈال دیتے ہیں جنہوں نے یہ واقعات ان کو بیان کیے۔ انہوں نے عموماً فکر وتحمیص وتدقیق اور صحیح وسقیم میں فرق کرنے سے پرہیز ہی رکھا۔ بعض مواقع پر البتہ وہ بحث وتمحیص کرتے ہیں۔ مثلاً طبری نے ہابیل وقابیل کے قصہ میں اس قول کو رد کیا ہے کہ یہ دو شخص آدمؑ کے زمانہ میں نہیں تھے اور نہ ہی قربانی آدمؑ کے زمانہ میں ہوئی اور یہ کہ زمین پر پہلی موت آدم علیہ السلام کی واقع ہوئی۔ ان سے پہلے کوئی نہ مرا تھا۔ ابن جریرؒ اس کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ہمارے نزدیک صحیح قول یہ ہے کہ قرآن پاک میں جس شخص کا ذکر ہوا ہے کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا وہ آدم علیہ السلام کا صلبی بیٹا تھا“ پھر طبری نے احادیث اور اقوال حضرت علیؓ سے استدلال کیا ہے۔ طبریؒ اکثر کہتے ہیں: ”زعم اهل التوراة وغيرهم“ یہ عبارت اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ان کی مرویات ومنقولات کے بارے میں متشکک ہیں۔

یہاں اس بات کی تنبیہ ضروری ہے کہ اوائل مؤرخین کا یہ منہج صرف گذشتہ زمانہ کے واقعات اور بدءِ خلق قصص انبیاء سابقین اور کائنات کے اسرار کی روایات میں تھا جن کی توضیح قرآن وسنت میں نہیں ہے۔ مذکورہ امور کا ذکر تاریخ اسلامی کے مقدمہ میں محصور ہے جو کہ بہت مختصر ہے جبکہ عہد اسلامی کے ساتھ متعلقہ روایات واخبار کے بارے میں عموماً تحمیص وتدقیق کی جاتی تھی اور بعض مؤرخین کا تساہل اس بات پر محمول ہے کہ تاریخ، عقائد واحکام کا کوئی یقینی مصدر نہیں ہے۔ اس مخصوص اور محدود طریق کار کی بنا پر جرجی زیدان وغیرہ نے مسلمان مؤرخین پر نقد وجرح کی اور ان کی خدمات کو اس طرح عیب ناک کیا کہ انہوں نے محض واقعات کو نقل کرنے پر اقتصار کیا ہے اور وہ کسی انتقاد وتحمیص کے بدون واقعات کو ایک یا متعدد راویوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ مستشرقین کا یہ الزام اگر ان مؤرخین پر جنہوں نے امم سابقہ، بدءِ خلق واسرار کائنات کے بارے میں روایات نقل کی ہیں یا ان پر ہوتا جنہوں نے حشو واختراع کو سمو لیا ہے تو اس کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن انہوں نے اس نقد وجرح میں غلو کیا اور تمام مؤرخین اور سارے ذخیرۂ تاریخ پر غیر مستند ہونے کا فتویٰ صادر کیا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں مادہ ”HISTORY“ کے تحت اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اوائل محققین کا اسلوبِ تالیف تحمیص وتدقیق پر مبنی تھا“ تاآنکہ فارسی، یونانی اور یہودی ومسیحی کتب کے تراجم

ہوئے اور رطب و یابس خرافات اور اباطیل کا ایک سیلاب اُمڈ پڑا اور مخترعین کی کثرت ہوگئی۔

خرافات و اساطیر کے اس سیلِ رواں اور وضاعین کی شرارت سامانیوں کے ملاحظہ کرنے کے بعد بعض علماء مسلمین نے واقعتہً کتابت تاریخ کے ایسے قوانین و قواعد وضع کیے جو تخمیص و تدقیق پر مبنی ہیں۔ مؤرخ کے لیے انہوں نے ان باتوں کو شرط قرار دیا ہے۔ (۱) صدق (۲) یہ کہ جب وہ نقل کرے تو معنی کے بجائے لفظ پر اعتماد کرے (۳) یہ کہ ایسا نہ ہو کہ مذاکرہ کے دوران اخذ کرے اور بعد میں لکھ لے (۴) یہ کہ منقول عنہ کا نام ذکر کرے پھر مروی عنہ کا ترجمہ اگر مؤرخ اپنی معلومات کی بنا پر کرتا ہے تو اس کے لیے شرط ہے: (۱) صاحب ترجمہ کے حالات سے علماً و دیناً و غیر ہما من الصفات واقف ہو۔ (۲) یہ کہ حسنِ تحریر اس کے پاس ہو اور الفاظ کے مدلولات جانتا ہو (۳) یہ کہ حسنِ تصور والا ہے اور ترجمہ کے وقت اس شخص کے تمام احوال کو تصور میں لا سکے اور اس کا ایسا تعارف کرائے جو واقع سے زیادہ ہو نہ کم (۴) یہ کہ ایسا نہ ہو کہ اس کی خواہشات اس پر غالب ہوں اور یہ خواہشات اس کو اس پر مجبور کریں کہ وہ اپنے محبوب شخص کی مدح اور دوسرے کی تقصیر کرے بلکہ یا تو خواہشات نفسانیہ سے عاری ہو یا وہ عادل ہو جس کے ذریعے سے وہ اپنی خواہش کو مغلوب کر لے اور طریقِ انصاف پر چل سکے۔

ابنِ خلدون کے لیے تاریخ لکھنے کا سب سے بڑا داعیہ تاریخ کو اخبارِ کاذبہ سے صاف کرنا اور ایک ایسا دستور وضع کرنا ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے تالیف و تدوینِ تاریخ میں مشغول حضرات صدق و کذب کے محتملات میں تمیز کر سکیں اور سرے سے ہی جھوٹی روایات سے اجتناب کر سکیں۔ ابن خلدون نے جھوٹی روایات کی تدوین کے اسباب تلاش کیے ہیں اور ان کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں۔

**سببِ اوّل:** تعصب اور گروہ بندی۔ انسان جب تعصب اور فرقہ بازی سے مغلوب ہو جائے تو وہ (طبعی طور پر) پہلے مرحلہ میں ہی اپنے مطلب کی آراء و اخبار کو قبول کر لیتا ہے اور یہ رجحان و تشیع عین بصیرت اور انتقاد و تمحیص کے درمیان پردہ ہوتا ہے۔ اس طرح انسان جھوٹی باتوں کو بھی قبول کر لیتا ہے اور اگر انسان غیر متعصب اور کسی گروہ کی طرف مائل نہ ہو تو وہ حالتِ اعتدال میں ہوتا ہے اور وہ کسی بھی خبر کی تمحیص و نظر کا حق ادا کرتا ہے حتیٰ کہ سچ اور جھوٹ واضح ہو جائے۔ اسی اصل کا ایک ذیلی سبب یہ ہے کہ لوگ زیادہ تر اصحابِ سلطنت اور اصحاب مراتب علیا کی مدح و ثناء، تحسین اور کثرتِ تذکرہ کے ذریعہ سے ان کی قربت حاصل کرتے ہیں اور ان کے بارے میں غیر حقیقی باتیں پھیلاتے ہیں۔ نفوس تو مدح و ثنا کے دلدادہ ہوتے ہیں اور لوگوں کو اہلِ دنیا کے ساتھ کوئی سروکار نہیں بلکہ وہ دنیا کی جاہ و ثروت کی تلاش میں ہوتے ہیں ابن خلدون نے ان امور کو بھی اسی اصل کے تحت ذکر کیا ہے: ناقلین پر اعتماد کرنا، ان کے بارے میں صدق

کا وہم کرنا، مقاصد سے غفلت کرنا اور روایات میں تدلیس اور تصنع سے جہالت برتنا۔ ابن خلدون نے ان اسباب کے لیے یہ قاعدہ جس کا التزام حق پانے کی خاطر مؤرخ کے لیے ضروری ہے، وضع کیا ہے کہ مورخ خواہشات نفسانی میلانات اور فرقہ بندی سے بالاتر ہو اور یہ کہ تمحیص و تدقیق اور ہر چیز کی پڑتال کرے پھر جس پر صدق کے احتمال کے ساتھ اس کا نفس مطمئن ہو تو اس کو مدوّن کرے۔

**سببِ ثانی:** وہ قوانین جن کے ظواہر طبیعت تابع ہیں مثلاً ظواہر فلک، کیمیا، طبیعت حیوانات و نباتات وغیرہ ان سے جہالت بھی ایک مرکزی سبب ہے۔ مؤرخین ان قوانین سے لاعلم ہونے کی وجہ سے اکثر ایسی روایات نقل کرتے ہیں جو ان قوانین سے متعارض ہیں اور جن کا وقوع محال ہے۔ مثلاً مسعودی نے اسکندر اعظم کے بارے میں نقل کیا ہے کہ جب سمندری جانوروں "الشیاطین البحریۃ" نے اسکندریہ بنانے سے روکا تو اس نے لکڑی کا ایک تابوت لیا جس کے اندر شیشے کا ایک صندوق تھا اور پھر اس کو لے کر سمندر کی گہرائی میں گیا اور ان شیطانی جانوروں کی صورتیں بنائیں اور پھر معدنی اجسام سے ان کی شکلیں تیار کرائیں اور ان کو عمارت کے سامنے نصب کر دیا۔ جب یہ شیاطین بحر نکلے اور ان خوفناک صورتوں کا معائنہ کیا تو ڈر کر بھاگ گئے اور پھر اسکندر نے اسکندریہ تعمیر کر لیا اور اسی طرح کی خرافات ایک طویل قصہ میں مذکور ہیں۔

ابن خلدون کی رائے میں روایات کے اس حصہ کا علاج تبھی ہو سکتا ہے جب مؤرخین علوم طبیعہ اور ان کے قوانین پر توجہ کریں اور ان قوانین کے منافی ہر چیز سے دور رہیں۔ اگر مسعودی علم وظائف اعضاء ان کے قوانین اور انسان و حیوان کی طبیعت تنفس سے باخبر ہوتا تو اسکندر کے بارے میں یہ محال روایت نقل نہ کرتا۔

**سببِ ثالث:** اجتماع انسانی کے ظواہر جن قوانین کے تابع ہیں ان سے یہ جہالت بھی ایک بڑا سبب ہے۔ اجتماعی ظواہر، خواہشات اور تکّے بندی سے نہیں چل سکتے بلکہ ان کی پشت پر ایسے ہی پختہ اور ثابت قوانین ہوتے ہیں جس طرح کہ ظواہر طبیعت میں۔ جب مؤرخ مجرد نقل پر اعتماد کرتا ہے اور عمرانیات کی طبیعت اور اجتماع انسانی کے علوم کے ساتھ فیصلہ نہیں کرتا تو بسا اوقات وہ جادۂ حق سے بھٹک بھی جاتا ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ مؤرخین ان قوانین سے نا واقفیت کی بنا پر ان قوانین کے معارض ایسی روایات درج کر لیتے ہیں جن کا محال ہونا محکم ہے۔ مثلاً مسعودی نے نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چھ لاکھ کی تعداد میں بیس سال کی عمر کے نوجوانوں کو وادی تیہ میں محصور کر دیا حالانکہ یعقوب علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے دوران کے مدت میں بنی اسرائیل کی تعداد کا اتنا بڑھ جانا ناممکن ہے

تورات کے مطابق دو رسولوں کے مابین صرف تین پشتوں کا فاصلہ ہے۔ موسیٰ بن امرام بن قیہان بن لادی بن یعقوب اور افزائشِ نسل کے قوانین اس قلیل مدت میں تعداد کے اس اضافہ سے انکار کرتے ہیں۔ اگر مسعودی ان قوانین سے واقف ہوتے تو ایسی خطا کبھی نہ کرتے۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ ملاحظہ ہے کہ ابن خلدون جو انگریز عالم اقتصادیات مالتھس (جو ڈیمو گرافی کا موجد سمجھا جاتا ہے) سے چار صدیاں پہلے گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنے مقدمہ تاریخ میں اگرچہ مردم شماری کے علم کا بطور ایک قانون کے ذکر نہیں کیا ہے، جس طرح کہ مالتھس نے کیا ہے، لیکن وہ اس علم سے آگاہ ضرور تھے۔ ان قوانین کی ایجاد چونکہ ابن خلدون کے زمانہ میں ہوئی اس لیے ان سے پہلے مؤرخین کو ان قوانین سے لاعلمی میں معذور سمجھا جائے۔

ابن خلدون کی رائے میں اس آخری سبب کا علاج یہ ہے کہ مؤرخ علم الاجتماع، عمرانیات سے واقفیت حاصل کرے اور ان علوم کے مطابق صحیح وسقیم کے مابین تمیز کرے۔

**حاصل کلام**: روایات و اخبار میں حق و باطل اور صدق و کذب کے مابین فرق کرنے کا یہ ایک برہانی قانون اور ضابطہ ہے جس میں شک کا کوئی دخل نہیں۔ جب مؤرخ عمرانیات سے متعلقہ حوادث کے بارے میں جانے گا تو وہ ان کے ردّ و قبول کا فیصلہ کر سکے گا۔

یہ وہ اہم قواعد ہیں جو علماء نے تاریخ کے طلبہ و مؤلفین کے لیے وضع کیے ہیں اور ایسے ہی قواعد و ضوابط کے ذریعے سے ہم کتبِ تاریخ کو خرافات و اساطیر اور اسرائیلیات سے پاک کر سکتے اور گروہی رجحانات تعصب اور فرقہ بندی سے نجات دلا سکتے ہیں اور بلاشبہ یہ ایک مشکل کام ہے جس میں نیت صادقہ اور کڑی پیہم جدوجہد کی ضرورت ہے۔ گورنمنٹس کے زیر سرپرستی و تائید کام کرنے والے علمی ادارے ہی اس کام کو کماحقہ سرانجام دے سکتے ہیں۔

البشریٰ یہ العالم الاسلامی مکۃ المکرمۃ، شمارہ ۱۲۳۲
۳۰ ستمبر ۱۹۹۱ء تا ۶ اکتوبر ۱۹۹۱ء)

بقیہ: فقہ حنفی کی مقبولیت کے وجوہ

اور خلفاءِ راشدینؓ کے عمل اور دیگر دلائل شرعیہ سے بالکل روشن اور ہویدا ہے جس کا کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔